علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

علیگ

● علیگ میں چھپنے والے تمام مواد کے لئے ادارہ ذمہ دار ہے۔

● ہر مہینہ کی دس اور ۲۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

ششماہی ایک روپیہ

فی پرچہ ۲ر

جلد ۱	۲۵ نومبر ۱۹۵۶ء	نمبر ۶

مسلم یونیورسٹی ——— کیوں؟

ہندوستان ایک سیکولر اسٹیٹ ہے۔ اور سیکولرازم کے متوالے اکثر یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ سیکولر اسٹیٹ میں مذہبی بنیادوں پر تعلیمی ادارے کیوں قائم کئے جائیں، کیوں مذہبی تفریق کو باقی رہنے دیا جائے اور کیوں نہ تمام مذہبی اور ثقافتی فرقوں کو ایک قومی سانچہ میں ڈھال دیا جائے! اور یہ سوال کچھ اس انداز سے اٹھایا جاتا ہے کہ روئے سخن صرف اقلیتی فرقوں کی طرف ہوتا ہے اور وہی اس عتاب کے شکار ہوتے ہیں۔

مسلم یونیورسٹی بھی اسی قسم کے معتوب اداروں میں سے ہے جو ابھی تک اپنا مقام حاصل نہیں کر سکی ہے، جسے آج بھی فرقہ پرستوں ہی کی نہیں سیکولرازم کے علمبرداروں کی بھی نظرہائے تیز تر سے دوچار ہونا پڑتا ہے، جس کا وجود ملک کی اکثریت کے لئے اب بھی ——— اب بھی جبکہ آزادی کو ۹ سال گزر چکے ہیں ——— قابل برداشت نہیں۔ بین الاقوامی میدان میں ہم پنچ شیل کے بلند بانگ نعروں کے سہارے کافی آگے نکل چکے ہیں، لیکن خود اپنے دیس میں باہمی مفاہمت اور انسانی ہمدردی کیلئے کوئی فضا پیدا نہیں کر سکے۔ آج بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان صدہا ناقابل عبور دیواریں کھڑی ہیں۔ ہم صدیوں سے ایک ہی ہوا میں سانس لے رہے ہیں، ایک ہی سرزمین میں رہتے اور بستے ہیں، لیکن ایک دوسرے سے اب بھی اتنے ہی دور ہیں جتنے یہاں آنے سے پہلے تھے۔ سالہا سال ایک ساتھ رہنے کے بعد بھی ہم ایک دوسرے کو بالکل نہیں سمجھ پائے ہیں۔ مسلمانوں کا کلچر، انکی زبان، ان کا مذہب یہ سب ہندوستان میں اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔ یہ خود اپنے دیس میں بدیسی ہیں۔ یہاں ان کا وجود بھی جرم ہے۔ ان سے بار بار وفاداری کے ثبوت پیش کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے، اور ——— ان کے ایک گروہ نے علی الاعلان طبقہ سے مفاہمت کی پالیسی کو تسلیم بھی کر لیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس دیس میں ہمارا وجود صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم اپنے آپ کو اکثریت میں ضم کر دیں، ان کے ایک ایک اشارے پر عمل کریں اور اپنی انفرادیت کا گلا گھونٹ دیں۔ یہ لوگ بات بات پر اپنی وفاداری کا ثبوت دیتے ہیں، ایسے بیان شائع کرتے ہیں جن میں اقلیتی فرقہ کو تلقین کی جاتی ہے کہ وہ اپنے جمہوری حقوق کے مطالبہ سے بھی باز آئیں۔ اس گروہ کا خیال ہے کہ مسلم یونیورسٹی کو اسی سپردگی کی پالیسی پر عمل کرنا چاہیے۔

اگر یہ نقطۂ نظر صحیح ہے تو کسی یونیورسٹی کو مسلم یونیورسٹی ہونا ہی نہیں چاہیے اس سے پہلے کہ کوئی ادارے نشانہ بنائے ہمیں خود اس یونیورسٹی کو بند کر دینا چاہیے۔ ان تمام فرسودہ روایات کا قلع قمع کر دینا چاہیے جو خوشامد اور زمانہ سازی جیسے جھوٹے اور مصنوعی سہاروں کے بل پر جی رہی ہیں ——— تاکہ "من و تو" کا امتیاز تو مٹ جائے اور پھر ہم بھی اپنے دیس میں اپنا پن محسوس کریں، کسی کو اپنی وفاداری اور سپردگی کا یقین دلانے کے بجائے خود اس دیس کے تمام کھلے اور ڈھکے خزانوں کے امین ٹھہرائے جائیں ——— لیکن اگر ایسا نہیں، اگر ہماری کوئی ثقافتی انفرادیت ہے تو پھر ہمیں سوچنا پڑیگا کہ جدید ہندوستان میں اس یونیورسٹی کی کیا حیثیت ہوگی؟ کیا ہم محض وفاداری کے ثبوت دے دیکر ہی جیتے رہیں گے یا ہمارا اپنا بھی ایک وقار ہے جسے روز روز صدمے پہنچنا اچھا نہیں اور جسے برقرار رکھنے کیلئے ہمیں ہر ممکن جد وجہد کرنی چاہیے؟

ہمیں غور کرنا چاہیے کہ کیوں ہندوستان کی ایک کثیر آبادی مسلم یونیورسٹی کو سمجھنے سے قاصر ہے؟ کیوں یہ سمجھا جاتا ہے کہ مسلم یونیورسٹی اینٹی نیشنل ادارہ ہے؟ کیوں ابھی تک ایسی فضا پیدا نہیں ہو سکی ہے جہاں لوگ یہ سمجھنے پر مجبور ہوں کہ اس سے قطع نظر کہ مسلم یونیورسٹی کا ماضی کیا رہا ہے، آج یہ ایک مخصوص کلچر کی ترجمانی کرتی ہے ——— ایک ایسے کلچر کی جسکے اثر کی چھاپ ہندوستانی تہذیب کے ایک ایک گوشہ پر لگی ہوئی ہے ——— اور سیکولر سماج میں ہر فرد کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنے تمدن، اپنی

زیرلب

۱۷ر نومبر کی شام کو چودھری سلطان صاحب پروردسٹ آفتاب ہال نے آفتاب ہوسٹل کا راؤنڈ لیا۔ چودھری صاحب ہمارے لئے نئے نہیں۔ انکی شفقت محبت اور حسن انتظام سے ہم سب لوگ واقف ہیں۔ آفتاب ہال میں انکی آمد پر ہم سب کو مسرت ہے اور ہال کے لڑکوں نے جو توقعات ان سے وابستہ کر لی ہیں وہ انھیں یقیناً پورا کریں گے۔

نئے پرووسٹ کی ہوسٹل میں راؤنڈ لینے کی رسم بڑی اچھی ہے۔ اس سے تمام لڑکوں کو اس کا موقع مل جاتا ہے کہ وہ ذاتی حیثیت سے پرووسٹ صاحب سے نیاز حاصل کر لیں۔ پرووسٹ صاحب بھی تمام لڑکوں سے متعارف ہو جاتے ہیں۔ مختلف کروں کے حسن و قبح سے واقفیت ہو جاتی ہے۔ باہمی ربط و ضبط کے لئے یہ تمام چیزیں بہت ضروری ہیں لیکن آفتاب ہوسٹل میں یہ راؤنڈ عجیب و غریب طریقہ سے ہوا۔ پتہ نہیں کیوں وارڈن صاحب کی طرف سے ایک نوٹس نکلا جس میں صرف چند لڑکوں سے خطاب کیا گیا تھا اور انھیں اس بات کی دعوت دی گئی تھی کہ وہ شام کو ۶ اور ۷ بجے کے درمیان اپنے اپنے کمروں پر رہیں۔ اسلئے کہ پرووسٹ صاحب ہوسٹل کا راؤنڈ لے رہے ہیں۔ معلوم نہیں کیوں انہی چند طلباء کو اس کام کیلئے مخصوص کیا گیا۔ اور کیوں اور لوگوں کو اس قابل نہیں سمجھا گیا کہ انھیں بھی شرف ملاقات بخشا جائے۔ اگر پرووسٹ صاحب کو انہی چند لڑکوں سے ملنا مقصود تھا تو پھر ٹھیک ہے ہمیں کوئی اعتراض نہیں ——— لیکن اگر بات ایسی نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر یہ تخصیص کیا معنی رکھتی ہے۔ یہ ایک دوعملی ہے اور تعلیمی اداروں میں جہاں استادوں کا اپنے شاگردوں سے یدرانہ تعلق ہوتا ہے۔ اس قسم کی دوعملی ضرور شاق گزرنی چاہیئے۔ ہماری مؤدبانہ گزارش ہے کہ اگر باقی ماندہ لوگ اس قابل نہ تھے کہ چودھری صاحب کو خوش آمدید کہہ سکیں تو بہتر ہے کہ انھیں آفتاب ہوسٹل میں رہنے کے حق سے بھی محروم کر دیا جائے ورنہ پھر ہم اس دوعملی کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہیں ——— شاید اسی دوعملی کا نتیجہ تھا کہ راؤنڈ کے وقت اکثر کمرے بند تھے۔ اسی قسم کی ایک بات ہمارے ہوسٹل کے گذشتہ پندرہ روزہ ڈنر میں پیش آئی تھی۔ ڈائننگ ہال میں میزوں کی تین قطاریں ہیں، ایک قطار کو خوب آراستہ کیا گیا۔ باقی دو قطاروں پر نہ میز پوش بچھائے گئے نہ انھیں سجایا گیا۔ آراستہ میزوں پر وارڈن صاحب اور ہوسٹل کے کچھ اور غیر معروف سے طلباء بیٹھے اور غیر آراستہ میزوں پر باقی ماندہ لڑکے۔ یہ ایک عجیب و غریب امتیاز برتا گیا تھا جسے ہوسٹل کے تمام لڑکوں نے شدت سے محسوس کیا۔ علی گڑھ میں سینیارٹی جونیارٹی کے تحت سب کام ہوتے ہیں۔ ہم بذات خود اس تقسیم کو لغو سمجھتے ہیں۔ لیکن یہاں یہ تفریق اس تقسیم کے مطابق بھی نہ تھی۔ پھر آخر وہ کون سا Criterion تھا جسکے مطابق

ان دونوں واقعات میں طلباء میں امتیاز برتا گیا ———؟

یہ ایک سوال ہے جو بہت دلوں سے تشنۂ جواب ہے ـــ جو

آج سے پہلے پردۂ افکار سے باہر بھی نہ آسکا!

یہ علی گڑھ ہے

یونین کے الیکشن بخیر و خوبی ختم ہو گئے۔ ایک ہفتہ کے ہنگامے اور جوش و خروش ختم ہو چکا ہے۔ فضا معمول پر آ گئی ہے۔ "علیگ" کے نمائندۂ خصوصی نے الیکشن سے متعلق کچھ اعداد و شمار جمع کئے ہیں۔ انکی صحت یا عدم صحت کے لئے ادارہ علیگ، آپ یا نمائندہ خصوصی کوئی ذمہ دار نہیں ہے۔

- خصوصی ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ الیکشن میں کابینہ کیلئے ۳۰، لائبریرین کے لئے ۵، سکریٹری کے لئے ۴ اور صدارت کے لئے ۴ امیدوار کھڑے ہوئے۔
- اندازہ لگایا جاتا ہے کہ الیکشن کے پروپیگنڈے کے لئے جتنے اشتہارات، کارڈ اور پمفلٹ وغیرہ چھپے ان سب کو اگر ایک لائن میں رکھ دیا جائے تو علی گڑھ کے گرد ۱۰ چکر لگ جائیں۔
- اس مواد کی طباعت میں تقریباً ۵۰ مزدوروں نے ۴۰۰ گھنٹے تک پریس میں کام کیا۔
- چھپائی کے کام میں جو اخراجات آئے ان کا اندازہ ۱۲۰۰ روپیہ لگایا جاتا ہے یعنی سید آصف علی (امیدوار برائے سکریٹری شپ) کے حاصل کردہ ووٹوں کے برابر۔
- ان اشتہاروں کو تقسیم کرنے کے لئے مختلف امیدواروں کے ورکروں نے جتنا راستہ طے کیا اس کا مجموعی فاصلہ ۵۰۰ میل، فرلانگ بتایا جاتا ہے یعنی علی گڑھ سے کلکتہ تک کی مسافت
- ووٹروں کو کنونس کرنے کے لئے تقریباً ۱۲۳ لڑکوں نے ۳ دن اور ۳ رات مستقل کام کیا۔ اس گفت و شنید میں تقریباً پچاس لاکھ الفاظ استعمال کئے گئے جنھیں ۲۰ لاکھ سے زیادہ صفحات پر لکھا جا سکتا ہے۔
- صدارت کے امیدواروں نے ووٹروں کو جو دعوتیں دیں ان میں اندازہ لگایا جاتا ہے کہ مجموعی طور پر ۱۵ پونڈ چائے، ۳ من شکر اور ایک من دودھ استعمال کیا گیا۔ تقریباً ۲ من نمک پارے اور برفی بھی صرف میں آئی۔ کہا جاتا ہے صدارت کے ایک امیدوار نے اپنے ورکروں کو ۲۰ مرغ اور ۳۰۰ انڈے کھلائے (ور وغ برگردن راوی)
- پولنگ کے دوران ووٹروں کے نقل و حمل میں جن موٹروں، کاروں، رکشوں اور سائیکلوں کو استعمال کیا گیا، انھوں نے کل ملا کر ۲۳۰ میل کا سفر کیا، اور تقریباً ۵۰ گیلن پیٹرول استعمال ہوا۔
- پولنگ بوتھز اور موٹروں میں مختلف امیدواروں کے ورکروں نے جو نعرے لگائے ان سب کو اگر ریکارڈ کیا جائے اور انھیں ریڈیو پر نشر کیا جائے تو دنیا بھر کے ریڈیو اسٹیشن ۵۰۰ گھنٹے تک مستقل براڈ کاسٹ کرتے رہیں۔
- الیکشن کے سارے کاروبار میں جو انسانی توانائی (Energy) صرف ہوئی اس کی مجموعی مقدار ۵۰۰ ہورس پاور سے زیادہ ہے۔
- اور اخراجات کا مجموعی اندازہ ۱۵ ہزار روپیہ لگایا جاتا ہے۔ رہے چھپے دیئے کے اخراجات، یہ راز کی باتیں ہیں، راز ہی میں رہیں تو اچھا ہے۔

علیگ کے ملنے کے پتے

علیگ، ایجوکیشنل بکڈپو، سنگھل بکڈپو، ۷ (ویسٹ بلاک) انجینیرنگ ہال، ۱۱۲ عثمانیہ، ۲۳ میکڈانل اور دفتر علیگ ۱۲۷ آفتاب ہوسٹل سے مل سکتا ہے

شیخ صاحب



شعبۂ تاریخ کے روحِ رواں اور حبیب صاحب کے چہیتے شاگرد، پروفیسر شیخ عبدالرشید، علی گڑھ کے محبوب ترین اساتذہ میں سے ہیں۔ چہرے پہ یونانی مفکروں کی سی گمبھیرتا، شکن آلود پیشانی اور گھنی پلکوں کے پیچھے تیز تیز نگاہیں، یہ ہیں شیخ صاحب جن کے رعب داب سے علی گڑھ میں ہر شخص ڈرتا ہے، لیکن اس ظاہری دم خم کے اندر وہ ایک پردرد، اور محبت کرنے والے دل کو چھپائے ہوئے ہیں، جو ذاتی مجلسوں میں خوب کھلتا ہے۔

شیخ صاحب کی ذات پنجاب کی تمام خصوصیات کی حامل ہے۔ وہی جرأت مندی اور بے باکی اور وہی بے ساختگی۔ وہ ہمیشہ ایک اور ایک 'دو' والی بات کرتے ہیں اور معاملات میں لاگ لپیٹ کے قائل نہیں۔

شیخ صاحب نے حبیب صاحب سے بہت کچھ سیکھا ہے، ان کی بے نیازانہ خدمت، علم کی سچی لگن اور بے تکان محنت، حبیب صاحب علی گڑھ میں ان کے قیام کا وسیلہ بھی ہیں، سہارا بھی۔

علی گڑھ اور علی گڑھ کی نیرنگیوں سے بڑی محبت کرتے ہیں۔ ۴۷ء کے پر آشوب زمانہ میں جب مسلم یونیورسٹی کا وجود خطرے میں تھا شیخ صاحب نے ایک جان نچھاور کرنے والے شیردل محافظ کی طرح راتوں کو پہرہ دیا ہے کہ علم و حکمت کی اس عظیم درسگاہ کو کوئی گزند نہ پہنچا سکے۔

یونیورسٹی کے پراکٹر رہے ہوں یا اسٹاف کلب کے سکریٹری، پروسٹ شپ ہو یا ڈین شپ، اپنے حسنِ انتظام، لیاقت اور سلیقہ کا شیخ صاحب نے ہر جگہ لوہا منوالیا ہے۔ انتظامی امور میں شیخ صاحب کے فیصلے آخری فیصلے سمجھے جاتے ہیں۔

ایک عالم کی حیثیت سے بھی شیخ صاحب غیر معمولی ذہانت، یادداشت اور علمیت کے مالک ہیں۔ وہ شعبۂ تاریخ کے صدر، ادارہ تاریخ ہند قرونِ وسطیٰ کے ڈائریکٹر اور حکومتِ ہند کے تاریخی اور آرکیولوجیکل مشاورتی کمیٹیوں کے رکن ہیں۔ شیخ صاحب عہد وسطیٰ کی تاریخ پر سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ خصوصاً اس دور کی مالیات پر ان کا کام اپنی افادیت کے اعتبار سے ہمعصر مورخوں میں انھیں ایک امتیازی حیثیت بخشتا ہے۔ سلاطین خلجی پر ان کی تصانیف بڑی وقعت رکھتی ہیں۔ شیخ صاحب کا زندہ رہنے والا کارنامہ ان کی تاریخ فیروزشاہی ہے جسے انھوں نے بڑے سلیقہ سے ایڈٹ کیا ہے۔ بالمکندنامہ، ضیاء الدین برنی، تاریخ داؤدی، انشائے ماہرو، فتوحات فیروزشاہی اور مفتاح الفتوح نادر دستاویزوں میں سے ہیں جنھیں شیخ صاحب نے ایڈٹ کرکے ہمیشہ کے لئے محفوظ کرلیا ہے۔ ہماری کتنی ہی نسلیں اپنی علمی منزلوں سے گزر کر فنا ہو چکی ہونگی لیکن جب آئندہ نسلوں میں سے کوئی عہد وسطیٰ کی تاریخ ہند پر تحقیق کرنا چاہے گا، تو شیخ صاحب کی محفوظ کردہ کتابیں اسکی راہ میں سنگ میل کا کام کرینگی۔ تاریخ پر ان کے نظریات کسی تعصب پر مبنی نہیں۔ وہ جس عہد پر قلم اٹھاتے ہیں، اس دور کے مخصوص ماحول میں ڈوب کر لکھتے ہیں اور واقعات اور حقائق کی پرکھ اور چھان بین میں بڑی دقت نظری سے کام لیتے ہیں۔

پڑھنا پڑھانا ان کا ہمیشہ سے محبوب مشغلہ رہا ہے، لیکن وہ ڈرامہ اور موسیقی کے بھی بڑے رسیا ہیں۔ انگریزی ادبیات کے بڑے شوقین ہیں کسی زمانہ میں شکار اور ہاکی سے بھی بڑا شغف تھا۔ سگار انھیں اپنے استاد سے ورثہ میں ملا ہے جو ہمہ وقت ان کا رفیق ہے۔

شیخ صاحب کی گھریلو زندگی بڑی پرسکون اور قابلِ رشک ہے۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ علی گڑھ میں تاریخ کے طلباء میں ان کا سا تاریخی شعور اور انہماک کسی ایک میں بھی نہ آسکا۔ ابھی شیخ صاحب کی ذات سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں ———!

ایڈیٹر کے نام ایک خط

یونیورسٹی ہسپتال

محترمی! السلام علیکم۔ یونیورسٹی ہسپتال سے متعلق آپ کا نوٹ پڑھا اور مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ آپ نے صرف خامیوں کا ذکر کیا ہے، خوبیوں کو قطعاً نظرانداز کر دیا۔ آپکو معلوم ہونا چاہئے کہ ہسپتال کے انتظام میں پچھلے ۵، ۶ سالوں میں جو بہتر تبدیلی ہوئی ہے اور خصوصاً ملیریا کے کنٹرول کے سلسلہ میں جو اقدامات لئے گئے ہیں، انکی مثال ملنا مشکل ہے۔ ہسپتال میں صفائی اور نفاست میں اضافہ ہوا ہے اور مریض پر ان چیزوں کا کتنا صحت مند اثر پڑتا ہے یہ کسے نہیں معلوم۔

آپ نے جن اموات کا ذکر کیا ہے، میرا خیال ہے آپکی رائے کسی ماہر امراض کی رائے نہیں ہے۔ مجھے تفصیل تو نہیں معلوم، ہاں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ممکن ہے تشخیص مرض میں کچھ غلطی ہوئی ہو لیکن اسے سراسر غلط کہنا درست نہیں۔ قضا و قدر پر کس کو اختیار ہے۔ ہم نے میڈیکل سائنس میں حیرت انگیز ترقی کر لی ہے لیکن موت پر ابھی تک قابو نہیں پا سکے ہیں۔ میرا خیال ہے آپ نے ذرا زیادہ جذبات سے کام لیا ہے۔ اور حقائق کو پس پشت ڈال دیا ہے۔

لیکن اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ آپ نے بڑی جرأت مندی سے کام لیا ہے۔ طلباء کی مشکلات یقیناً پیش کرنی چاہئیں۔ میں کم از کم آپکی اسپرٹ کی قدر کرتا ہوں۔

[ظہیر احمد (بی ایس سی فائنل) دودھ پور علی گڑھ]

(علیگ) آپ نے ہسپتال کی جن خوبیوں کا ذکر کیا ہے ان سے ہمیں بھی انکار نہیں لیکن دراصل آپ ہماری نیت نہ سمجھ سکے۔ ہم صرف خامیوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتے تھے۔ خوبیاں تو اپنی جگہ ہیں ہی، اور وہ یقیناً قابل تعریف ہیں۔ ہسپتال کے سلسلہ میں علیگ کا رویہ صرف اصلاحی رہا ہے اسے ہماری بدنیتی پر محمول کرنا درست نہیں۔ کسی بھی چیز کی اچھائیاں گنانے والے بہت ہیں لیکن برائیوں اور خامیوں کی طرف توجہ دلانے والے بہت کم ہوتے ہیں [illegible]

پیسے ملے تو جوش مسلمان ہو گیا

(شاد عارفی)

[یہ نظم جوش کے جانے کے فوراً بعد لکھی گئی تھی اور ہند و پاک کے اکثر معتبر رسالوں کو بھیجی گئی اور ہر رسالے کے اڈیٹر نے اس معذرت کے ساتھ واپس کر دی کہ جوش صاحب سے تعلقات ختم ہو جائیں گے۔ جوش کی ہجرت کی پہلی برسی پر اردو کے عظیم طنز نگار شاعر شاد عارفی کی یہ نظم شائع کرنے کی سعادت "علیگ" کو حاصل ہو رہی ہے۔]

اپنی خودی پہ آپ ہی قربان ہو گیا — ہر شخص اس قرار پہ حیران ہو گیا
پیسے ملے تو جوش مسلمان ہو گیا

تخلیق کر ہزار بہانے سخن فریب — باتیں بنا تراش فسانے وطن فریب
لیکن ترا ضمیر پشیمان ہو گیا

جنگو بڑا کہا تھا انہی کی پناہ لی — بگڑی جو بتکدے سے تو کعبہ کی راہ لی
ایمان کی تو یہ ہے کہ ایمان ہو گیا

ہر چند لیگیوں میں مکرم ہوا تو کیا — سرمایۂ نشاط فراہم ہوا تو کیا
تیرا کلام تجھ پہ بلیدان ہو گیا

افسوس تو نے حبّ وطن پر کیا نہ غور — انساں کی بات اور ہے گھوڑے کی بات اور
باندھا گیا جہاں بھی وہیں تھان ہو گیا

کشمیر کے بہشت میں اے رند ناتمام — لینے چلا تھا حضرت آدم کا انتقام
اور بندۂ خدا علی الاعلان ہو گیا

ہجرت سے گو تلافیٔ مافات ہو گئی — لیکن بتا یہ کون بڑی بات ہو گئی
کیا تو جہان پاک کا سلطان ہو گیا

مجلا گیا جبینِ وفا تیرا حادثہ — کچھ اور تو ہوا نہ ہوا تیرا حادثہ
ہم شاعرانِ ہند پہ بہتان ہو گیا

جب قوم پر عتاب نہ آیا بروئے کار — جب شورِ انقلاب نہ آیا بروئے کار
خود نذرِ انقلاب مری جان ہو گیا

مجھکو تو دیکھ ترکِ وطن کا نہیں خیال — جب تک نہ باغبان چمن ہی مجھے نکال
حالانکہ الجھنوں سے پریشان ہو گیا

(بقیہ صفحہ ایک) تہذیبی اور علمی روایات اور اپنی زبان کو جس طرح چاہے ترقی دے۔ اسکی یہ جدوجہد نہ آئین سے انحراف ہے، نہ ملک دشمنی کے مترادف! کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم خود اپنے آپ کو نہیں سمجھ پائے ہیں! ممکن ہے خود ہمارے ذہن میں اپنی کوئی حیثیت متعین نہ ہو، اور ایسا ضرور ہے، ورنہ کیوں اسکی ضرورت پیش آتی ہے کہ حکمراں طبقہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ہم اپنی خودداری اور حمیت سب کچھ قربان کر ڈالتے ہیں۔ کچھ تو ہے کہ ہمیں اپنے جائز حقوق کے مطالبہ سے بھی ڈر لگتا ہے ہمیں خود اپنے وجود پر شرم آتی ہے۔

اگر یہ صحیح ہے کہ ہندوستان میں ہماری کوئی حیثیت نہیں اور ہم یہاں بدیسی ہیں تو یقیناً ہمیں بار بار اپنی وفاداری کے ثبوت پیش کرنا چاہئیں۔ ہر ہر قدم پر حکمراں طبقہ کے آگے سپر ڈال دینی چاہئے ——— لیکن اگر ایسا نہیں تو پھر آخر یہ سب کیا ہے؟؟ ہم کیوں اپنی انفرادی حیثیت کو ختم کر دیں اور کیوں وفاداری کے مصنوعی ثبوت فراہم کرکے اپنی خودداری اور حمیت کو مجروح کریں ———؟

مسلم یونیورسٹی ہمارا جرم نہیں ہماری آبرو ہے، اسے چھپانا نہیں ہے، ملک کے ایک ایک فرد سے تسلیم کرانا ہے ———!

علیگ کے لئے لکھئے

علی گڑھ ادیبوں کی کان ہے ہم ان سب کو مندرجہ ذیل موضوعات پر لکھنے کی صلائے عام دیتے ہیں

۱۔ مسلمان ہندوستان میں۔
۲۔ آزاد ہندوستان میں نئے علی گڑھ کا رول۔
۳۔ ہندوستانی کلچر کا مسئلہ۔

ہمارے ملک کو اور اسلئے علیگ کو افسانوں، نظموں اور الجھے ہوئے تنقیدی مضمونوں کی ضرورت نہیں۔ ان جاندار مسائل پر قلم اٹھا کر وقت کی اہم ترین ضرورت پوری کیجئے۔

تاریخ مدرسۃ العلوم علی گڑھ

(پروفیسر تھیوڈور ماریسن)

(۳)

اگرچہ ایجوکیشنل کانفرنس کی کارروائی علی گڑھ سے ہوئی تھی اور سرسید تادم حیات اس کے مستقل سکریٹری رہے، لیکن اسے محض کالج کا ایک آرگن بنانے کا کبھی خیال نہیں کیا گیا تھا۔ بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ ان تمام تحریکوں کو جو قوم کی فلاح کیلئے اٹھ رہی تھیں ایک مرکزیت دیدی جائے۔ گزشتہ چند برسوں میں تعصبات دور کرنے اور تعلیم و ترقی کے جذبات کی اشاعت میں کانفرنس نے قابل قدر خدمات انجام دی ہیں لیکن سرسید کی پیرانہ سالی کی وجہ سے یہ ممکن نہ تھا کہ علی گڑھ سے زیادہ فاصلہ پر اسے منعقد کیا جائے اور اس طرح کانفرنس کا پورا فائدہ انکے انتقال کے بعد تک ظاہر نہ ہوا۔

لیکن مجھے پھر کالج کی تاریخ کی طرف پلٹ آنا چاہیئے۔ پروفیسر جے۔ سی۔ چکرورتی اسی سال ریاضی کے پروفیسر کی حیثیت سے کالج کے اسٹاف میں شامل ہوئے جس سال تی ڈبلیو آرنلڈ ہوئے تھے۔ پروفیسر چکرورتی ایسے وقت میں کلکتہ سے آئے تھے جب بنگالی سیاست دانوں کی علی گڑھ میں بڑی گت بن رہی تھی۔ اور یہ خیال غلط نہیں کہ کبھی نہ کبھی کوئی بات ایسی ضرور کہی جاتی ہوگی جو ان کے لئے رنج کا سبب ہوتی ہو۔ لیکن انھوں نے اپنے آپ کو ایک قابل تعریف استاد اور قابل اعتماد رفیق ہی ثابت نہیں کیا بلکہ کالج کی ترقی اور اس مقصد کو جس کے لئے کالج قائم کیا گیا تھا آگے بڑھانے میں ہمدردانہ حصہ لیا ہے۔ کالج کے مسلم ٹرسٹیوں کی نظر میں ان کی جو عزت اور اعتماد تھا وہ اس وقت ظاہر ہوا جب وہ ۱۸۹۹ء میں کالج کے رجسٹرار مقرر ہوئے۔ یہ عہدہ جس پر وہ اب تک متعین ہیں، انکی ذاتی آسائش میں خلل انداز ہو رہا ہے، تاہم کالج کیلئے بہت مفید ہے۔ ۱۸۹۱ء میں طلبار کی تعداد ۳۱۰ تک پہنچ گئی تھی، ان میں سے ۱۹۴ بورڈر تھے۔ اس وقت سے یہ تعداد لگاتار بڑھتی رہی یہانتک کہ ۱۸۹۵ء میں اسکول اور کالج میں کل تعداد ۵۶۵ ہوگئی جس میں سے ۳۲۹ بورڈنگ ہاؤس میں رہتے تھے۔ یہ دو ہر لحاظ سے ہمہ گیر ترقی کا دور تھا۔ اسٹاف تقریباً مستقل اور سرسید کی منشار کے مطابق تھا۔ یونیورسٹی کے امتحانات کے نتائج بہتر نکل رہے تھے اور ان سے کالج کی مقبولیت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اور اسکے ساتھ ہی ساتھ بورڈنگ ہاؤس کی زندگی بڑی دلچسپ اور بھرپور ہوتی گئی۔ جو طلبار اس زمانے میں کالج سے فارغ التحصیل ہو نکلے ان کے دلوں میں ابتک کالج کے لئے سچی محبت باقی ہے۔ اور ان میں سے اکثر نے کالج کی بہبودی کے لئے آئندہ سالوں میں کافی کوشش کی ہے۔ میں ۱۸۸۹ء میں کالج میں شامل ہوا تھا اور اسلئے میں اس قابل ہوں کہ اس زمانہ کی تعریف کرسکوں جسکو پرانے طلبار، جو ماضی کے بے انتہا مداح ہیں، بعض اوقات کالج کا "زریں دور" کہتے ہیں۔ نمونہ کے طور پر ۱۸۹۲-۹۳ء کو لیجئے ——— اس سال خوشی محمد نے بی۔ اے فارسی اور انگریزی میں اعزاز (آنرز) لیکر پاس کیا۔ اس سے پہلے کے چار سالوں میں جب وہ کالج میں تھے انھوں نے یہاں کی علمی زندگی میں نمایاں حصہ لیا ——— لانگ فیلو (جن کا چھ فٹ تین انچ کا قد اس کو اس تخلص کا مستحق بناتا ہے) کی اردو نظمیں ان دنوں کے تفریحی ادب کا ایک اہم حصہ تھیں۔ اور اس کے ساتھ ہی انھوں نے "الفرض" اور "اخوان الصفا" کے کام میں مسٹر آرنلڈ کا پورے انہماک سے ساتھ دیا ——— علاء الحسن حال ڈپٹی کلکٹر الہ آباد جو ان دنوں بے انتہا زندہ دل اور سب سے بڑھ کر سچے اور مخلص دوست سمجھے جاتے تھے، غلام الثقلین جو اس وقت بھی اپنی ذہنی انفرادیت کے لیے مشہور تھے، حامد علی خاں جن کی ڈپٹی کلکٹری کے دوران بے وقت موت بے انتہا رنج و غم کا سبب ہوئی تھی اور پھر ڈائریں شوکت علی، اسلام احمد، قطب الدین احمد اور قمر علی ——— یہ سب اسی سال پڑھتے تھے۔ بورڈنگ ہاؤس کے قواعد کا اثر لڑکوں پر بہت کم ہوتا تھا، کیونکہ کبھی کبھی گشتی نوٹس کے ذریعہ ان قواعد کا اعلان تو کیا جاتا تھا لیکن کوئی افسران کی نگرانی کے لئے مقرر نہ تھا جو یہ دیکھے کہ ان پر عمل بھی ہو رہا ہے یا نہیں، بعض اوقات تو وہ قواعد ذہن سے بالکل محو ہو جاتے تھے۔ اسٹاف کے ممبروں کو پڑھانے کے علاوہ اور کوئی کام نہ تھا اور جماعتیں اس وقت چھوٹی چھوٹی تھیں۔ (یعنی اس سال ۱۶ لڑکوں نے بی۔ اے ۲۲ لڑکوں نے انٹر کے امتحانات میں شرکت کی) ان لڑکوں کے لئے واقعی وہ زریں دور تھا۔ وہ آجکل کی طرح اسوقت بھی کھیلوں، کلبوں اور کالج کی سوسائٹیوں میں حصہ لیتے تھے لیکن اس میں ان کی فرصت کا ایک بہت قلیل حصہ صرف ہوتا تھا۔ درحقیقت جب میں اس وقت کا خیال کرتا ہوں تو مجھے تعجب ہوتا ہے کہ اسٹاف کو کس قدر فرصت ملتی تھی۔ اگر کسی افسر کی قدر و قیمت کا اندازہ اس امر سے کیا جاتا ہے کہ اس سے کتنا کام لیا گیا تو دراصل ٹرسٹیان کالج پیشتر کی نسبت موجودہ اسٹاف سے اپنے روپیہ کے عوض زیادہ عمدہ کام لیتے ہیں۔ لیکن اس وقت اساتذہ آجکل کے مقابلہ میں ذرا سی زحمت اٹھا کر فرداً فرداً طلبار کی طرف زیادہ توجہ دے سکتے تھے اور دیتے تھے۔ اگر ٹرسٹیوں کی یہ خواہش ہے کہ استادوں اور شاگردوں کے درمیان جو تعلقات پہلے تھے وہ پھر تازہ کئے جائیں تو انھیں دونوں کے درمیان پہلی نسبت بھی قائم کرنی چاہیئے۔ ایسا کرنے کے لئے انھیں اسٹاف میں ایک ہندوستانی اور چار انگریز استاد بڑھانے پڑیں گے۔

اگرچہ جیسا کہ میں بیان کرچکا ہوں، بورڈنگ ہاؤس میں بہت کم قواعد جاری تھے اور اس زمانہ کا انتظام ہماری نظر میں بحیثیت نامکمل معلوم ہوتا ہے تاہم کالج کے احاطے کے اندر کی زندگی بڑی پرجوش اور ولولہ انگیز تھی۔ بورڈنگ ہاؤس اور ہوسٹلوں کا مقصد صحت مند سوشل زندگی فراہم کرنا ہے۔ اور اس ماحول میں

برائی کی عدم موجودگی اتنی اہم نہیں ہوتی جتنا نیکی کا وجود۔ حال ہی میں یونیورسٹی کمشنروں نے اپنی رپورٹ کی دفعہ ۲۵ میں یہ سمجھ کر کہ ہمارے نظام کا اصل اصول نگرانی (یعنی پراکٹر اور سب پراکٹر) ہے بڑی غلطی کی ہے۔ لیکن یہ دیکھنے کے لئے علی گڑھ کا نظم پہلے بھی اتنا ہی موثر تھا، جبکہ پراکٹر اور سب پراکٹروں کا کوئی تصور بھی نہ تھا، ہمیں صرف ۱۸۹۲-۹۳ء کی مثال سامنے رکھنی چاہئے۔ اگر کسی کالج کی سوشل لائف میں ایسے اجزاء موجود ہیں جو ایک نوجوان کے قوائے ذہنی کو حرکت میں لاتے ہیں، جو اسکو ذاتی اغراض کے تنگ کوچے سے نکال کر اس میں نیک اور ابدی مقاصد کے حصول کا ولولہ پیدا کرتے ہیں۔ تو وہ کالج ان مقاصد کو نہایت عمدگی سے پورا کرتا ہے جن کے لئے کہ قائم کیا گیا تھا، چاہے اس کے سزا دینے کے ذرائع نامکمل ہی ہوں۔ اب میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ۱۸۹۲-۹۳ء میں علی گڑھ کی یہی حالت تھی۔ اس زمانہ میں کئی ایک علمی اور اخلاقی تحریکیں چل رہی تھیں جن کا طلباء پر گہرا اثر پڑا۔ مثلاً اس وقت 'ڈیوٹی' یا 'انجمن الفرض' تھی جو ۱۸۹۲ء میں اسلئے قائم کی گئی تھی کہ غریب طلباء کو وظیفہ دینے کے لئے چندے جمع کرے اور مسلمانوں میں کالج کے خلاف پھیلے ہوئے شبہات کو دور کرے۔ اس سوسائٹی کے اراکین کا جو اپنے آپ کو خادمان الفرض کے نام سے پکارتے ہیں۔ یہ معمول ہے کہ تعطیل میں چندہ جمع کرتے پھرتے ہیں۔ ۱۸۹۲-۹۳ء میں ۹۵۳ روپیہ وظائف کے لئے اور تقریباً اتنی ہی رقم غریب طلباء کے لئے بورڈنگ ہاؤس بنانے کے لئے اس طرح جمع کی گئی تھی۔ اس سال مسٹر بیک نے کہا تھا کہ طلباء میں حب الوطنی کے خیالات کو عام کرنے اور پبلک اسپرٹ کو پھیلانے میں اس سوسائٹی کے اثر کی جتنی تعریف کی جائے بجا ہے۔ ڈیوٹی سوسائٹی نے اس وقت سے حیرت انگیز ترقی کی ہے اس کے پاس ۳۱،۰۲۱ روپیہ کا کل سرمایہ ہے یہ طلباء کے وفد ہندوستان کے مختلف صوبوں میں بھیجتی ہے اور گزشتہ سالانہ چھٹیوں میں ۱۸،۱۵۶ روپیہ جمع کیا گیا۔ کام کا زیادہ حصہ جیسا کہ پہلے دستور تھا۔ خود طلباء اپنی رضامندی سے کرتے ہیں ۱۸۹۲-۹۳ء میں ایک اور سوسائٹی 'برادرہڈ' تقریباً انھیں مقاصد کیلئے بنائی گئی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ کالج چھوڑنے کے بعد ہر طالب علم سے اس کی آمدنی کا ایک فیصدی حصہ حاصل کیا جائے۔ یہ سوسائٹی اگرچہ کالج کی ترقی کیلئے والہانہ جوش اور سرگرمی کا نتیجہ تھی لیکن چھوٹی چھوٹی رقموں کو جمع کرنے کی دقت نے اسے بتدریج کمزور بنا دیا۔ اخوان الصفا کیلئے بھی یہی شباب کا زمانہ تھا۔ اخوان الصفا کو مسٹر آرنلڈ نے مضامین پڑھنے کے لئے اسکی ہمنام بغدادی جماعت کی تقلید میں قائم کیا تھا، لیکن انھوں نے اسکو اسم بامسمّٰی بنانے کیلئے اس میں ایک نئی اخلاقی روح پھونک دی۔ اس سال سید زین الدین (جو اب ڈپٹی کلکٹر ہیں) یونین کا نائب صدر تھے، اور شوکت علی (موجودہ سب ڈپٹی اوپیم ایجنٹ) کرکٹ کے کپتان تھے۔ وہ ایک اچھے کھلاڑی کی حیثیت سے ہردلعزیز تھے اگرچہ ۱۸۹۲-۹۳ء کچھ ایسا بہت کامیابی کا سال نہ تھا، تاہم شوکت علی نے کرکٹ کی مقبولیت میں بہت اضافہ کیا اور ایسے کپتانوں نے اس تحریک سے فائدہ اٹھایا جو انھوں نے کھیل میں پیدا کر دی تھی۔

یہ امر کہ علی گڑھ کی اقامت مسلمان لڑکوں پر خاص چھاپ لگا دیتی تھی، رفتہ رفتہ تسلیم کیا جا رہا تھا۔ ۲۰ اکتوبر ۱۸۹۲ء کو سر آکلینڈ کالون نے کہا تھا — "میں نے بارہا تجربہ سے معلوم کیا ہے کہ علی گڑھ کا طالب علم ہونا، انگریزوں اور ہندوستانیوں کی نظر میں عزت اور اعتبار حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ وہ جاتے وقت اپنی تربیت کا اثر بھی ساتھ لے جاتے ہیں، اور اس شخص کے ذہن کی گہری چھاپ بھی جس کے تحت یہ تربیت حاصل کی گئی تھی۔"

لیکن آئندہ سال یعنی ۱۸۹۳-۹۴ء میں ایک خطرہ کی گھنٹی سنائی دینے لگی، ذیل کا اقتباس سالانہ رپورٹ سے لیا گیا ہے جسے میں نے بحیثیت قائم مقام پرنسپل کے مرتب کیا تھا، معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ کالج پر ایک بھرپور تنقید ہے:

"مجھے امید ہے کہ نہ تو ٹرسٹیز اور نہ پبلک امتحان کے نتائج کو (خواہ وہ بُرے ہوں یا اچھے) ہمارے طریقۂ تعلیم کی کسوٹی سمجھیں گے۔ ایسا کرنا کالج کے مقاصد کو فراموش کر دینا ہے۔ بورڈنگ ہاؤس کی اخلاقی اور علمی حالت کئی امتحانات کے مقابلہ میں زیادہ اہم ہے۔ اگرچہ اسکے نتائج کی تفصیل آسانی سے نہیں دی جا سکتی۔ کالج کی روز افزوں مقبولیت کی وجہ سے پچھلے دو سالوں میں بہت سے ایسے لڑکے کالج میں داخل ہوئے ہیں جو ہمارے اسکول سے فارغ التحصیل نہیں، چونکہ یہ طلباء ایم۔ اے۔ او کالج کی روایات سے یکسر ناواقف ہیں، اور انٹر کلاسز کی اکثریت انھی طلباء پر مشتمل ہے اس کا اندیشہ ہے کہ ان روایات میں کوئی تبدیلی ہو جائے چونکہ ہمارے طلباء کا خصوصی کردار ہوسٹلوں کی روایات کے زیر سایہ ڈھالا جاتا ہے ٹرسٹیز ان روایات میں کسی بنیادی تبدیلی کے خیال کو بغیر اندیشہ کے نہیں دیکھ سکتے۔ اور چونکہ طلباء پر اساتذہ کا ذاتی اثر سال بسال کم ہوتا جا رہا ہے۔ اسلئے کہ طلباء کی بڑھتی ہوئی تعداد کی وجہ سے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ بہت سے لڑکوں سے فرداً فرداً واقفیت رکھیں، ٹرسٹیز کا فرض ہے کہ وہ یہ سوچیں کہ ان روایات کو کس طرح قائم رکھا جا سکتا ہے اور کس طرح علمی اور اخلاقی حالت بہتر کی جا سکتی ہے۔"

ان دنوں میں اس تحریر کو جو میں نے آج سے ۹ سال پہلے لکھی تھی اور زیادہ زور سے دہراتا ہوں۔ ۱۸۹۳ء میں مولوی عبداللہ صاحب کالج میں وہ فرائض سرانجام دینے کے لئے مقرر کئے گئے جو انگلستان کے کالجوں میں ڈین کرتا ہے۔ امید کی گئی تھی کہ ایک پکا مسلمان جس میں تبلیغی جوش بھی موجود ہو بورڈنگ ہاؤس میں ایک نئی مذہبی روح پھونک دیگا۔ لیکن ان کے تقرر کے وقت ہی ایسا اندیشہ تھا کہ وہ تربیت کے اہم ترین معاملات کو نظرانداز کر کے فروعات میں پھنسے رہیںگے۔ اس کالج میں ایک رائڈنگ اسکول بھی قائم کیا گیا۔ اور اس اضافہ سے کالج میں جسمانی ورزش کی وہ ساری سہولتیں مکمل ہو گئیں جنھیں عام طلباء کے محدود وسائل برداشت کر سکتے ہیں۔

۱۸۹۵ء میں اسکول اور کالج میں طلباء کی کل تعداد ۵۶۵ تھی۔ جن میں سے ۵۰۶ مسلمان تھے یہ ایک ایسی تعداد تھی جو اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی اور جس میں ۱۹۰۲ء تک کوئی اضافہ نہ ہوسکا۔

میری ساری امیدیں آپ سے وابستہ ہیں - یونیورسٹی آپ کے لئے ہے اور ہم آپکے خادم

میں چاہتا ہوں یہاں آپکی بات زیادہ سے زیادہ سنی جائے، سب سے پہلے آپ ہیں، اسکے بعد اساتذہ اور اسکے بعد ملک و قوم

یونین کی رسم تنصیب کے موقع پر زیدی صاحب کا طلباء سے خطاب

یونین کی نئی منسٹری کی رسم مسند نشینی ۲۱ نومبر کو شام ۶½ بجے اسٹریچی ہال میں ادا کی گئی۔ میٹنگ کی ابتدا تلاوت قرآن پاک سے ہوئی۔ زیدی صاحب نے کابینہ کے اراکین کا تعارف کرایا اور انھیں ہار پہنائے گئے۔ لیکن جب لڑکیوں کی باری آئی تو ہال میں وحشیانہ ہوٹنگ شروع ہو گئی، جس بدتہذیبی کا مظاہرہ کیا گیا اس کا تقاضہ تو یہ ہے کہ لڑکیوں کو اس سے سبق لینا چاہئے، جس معاشرے میں خواتین کے لئے عزت و احترام نہیں، اسے وحشی اور غیر متمدن نہیں تو اور کیا کہا جائے۔ کابینہ کے بعد لائبریرین، معتمد اعزازی اور صدر کے نام پکارے گئے۔ صدر کے نام پر ہال میں سب سے زیادہ جوش اور خروش کا اظہار کیا گیا۔

مس افسر رشید (سابقہ صدر) نے اپنی منسٹری کے کارناموں کی ایک رپورٹ پیش کی، رپورٹ کچھ اس انداز سے پیش کی گئی اور اس طرح سنی گئی کہ بہت کم لوگ سن سکے کہ کیا کہا جا رہا ہے، بہرحال خیال یہ ہے کہ انھوں نے اپنی کوتاہیوں اور کامرانیوں کا ذکر کیا ہوگا۔ اسکے بعد ضیاء الحسن ہاشمی (صدر منتخب) نے اپنا خطبہ پڑھا۔ جسمیں انھوں نے مسلم یونیورسٹی کو صحیح معنی میں مسلم یونیورسٹی بنانے کے عزم کا اعلان کیا اور بشارت دی کہ اپنے عہد صدارت میں وہ اپنی حد تک اس کام کو پورا کرنے کی کوشش کرینگے۔ وہ کیا کرنا چاہتے ہیں یہ بات پورا خطبہ سننے کے بعد بھی مبہم ہی رہی۔

سلطان علی شیدا نے (جو ہارنے والوں میں ایک تھے) نئے صدر کو تعاون کا یقین دلایا، انھوں نے کہا میں ہر مناسب کام میں آپ کے ساتھ ہونگا۔ لیکن اگر آپ نے عام طلباء کے مفاد کے مقابلہ میں اپنے اور اپنے جماعتی اصولوں کو ترجیح دی تو یقیناً جمہوری ذرائع کی مدد سے آپ سے بازپرس کی جائیگی۔ شیدا نے کہا "اس دفعہ کا الیکشن ہماری تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ مذہبیت نے ہمیں اندھا کر دیا تھا، ہندوؤں نے ہندوؤں کو اور مسلمانوں نے مسلمانوں کو ووٹ دئے۔ یہ ایک قابل غور بات ہے جو ہم سب کی توجہ کی محتاج ہے۔" تعجب ہے صدارت کے لئے دو اور امیدوار بھی تھے لیکن ان میں سے ایک بھی نہ بولا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کے پیچھے کوئی ٹھوس اصول نہ تھے بلکہ محض ہنگامہ بازی کے لئے کھڑے ہوئے تھے، اور اپنے مناسب انجام کو پہنچے۔ معتمد اعزازی سید آصف علی نے اپنا لائحہ عمل اور پروگرام پیش کیا۔ انکی مقابل مس نگہت حسنین نے کہا "یونین کی تاریخ میں پہلی مرتبہ کسی لڑکی نے سکریٹری شپ کا الیکشن لڑا تھا اور آپ نے اسے ہرا دیا ہے۔ لیکن یاد رکھئے وہ وقت دور نہیں جب ایک لڑکی صدر ہوگی، ایک لڑکی معتمد اعزازی ہوگی اور ایک لڑکی لائبریرین ہوگی۔" ان کا لب و لہجہ ایسا تھا

ہاشمی، آصف اور رؤف بھاری اکثریت سے منتخب
یونین الیکشن میں ایس۔ ایف کی زبردست شکست

۱۸ نومبر کو یونین کے سالانہ انتخابات ہوئے۔ معمول کے خلاف اس مرتبہ صدارت کیلئے ۴ امیدوار کھڑے ہوئے، ایک این۔ آر۔ سی سے اور تین ہالوں سے۔ ہال سے کھڑے ہونے والے امیدوار مسلمان تھے اور این۔ آر۔ سی سے غیر مسلم۔ اس مرتبہ الیکشن خالص فرقہ وارانہ بنیادوں پر ہوئے۔ ہندوؤں نے چاہا کہ ہندو منتخب ہو اور مسلمانوں میں تین امیدوار تھے، وہ صرف اس امید پر تھے کہ وہ مسلمان ہیں اور مسلمان لڑکے، ہندو کے مقابلہ میں انھیں ووٹ دینگے، ایک کچھ اصولوں کی خاطر کھڑا ہوا تھا۔ اسکے ذہن میں ہندو اور مسلمان کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ صبح ۸ بجے جب پولنگ شروع ہوا سب کو یہی گمان تھا کہ ہندو امیدوار کا جیتنا یقینی ہے لیکن یہ احساس اس شدت سے تمام ذہنوں میں سرایت کر گیا کہ مسلمانوں میں مسلم پرستی کی فضا پیدا ہو گئی اور چونکہ یہ خبر بڑے زور و شور سے پھیلا دی گئی تھی کہ ہاشمی صاحب کا ہونا یقینی ہے۔ وہ لوگ بھی جو شیدا صاحب کو ووٹ دینا چاہتے تھے اس رو کی زد میں آگئے۔ صدارت کے چاروں امیدواروں میں سب سے کم ووٹ راؤ صاحب نے حاصل کئے یعنی صرف ۲۵۲۔ کل پولنگ ۲۰۳۸ کا ہوا۔

نتائج کا اعلان لیمپ کی مدھم مدھم روشنی میں رات کو ۱۲ بجکر ۱۰ منٹ پر یونین کی بالکونی سے مس افسر رشید (صدر) نے کیا۔ سب لوگ سردی سے بے نیاز ہمہ تن گوش کھڑے تھے۔ نتائج حسب ذیل ہیں:-

صدر:- سید ضیاء الحسن ہاشمی (۱۲۵۱)، معتمد اعزازی:- سید آصف علی (۱۴۸۰) آنریری لائبریرین:- حافظ عبدالرؤف (۱۰۹۲)، سینئر کیبنٹ:- ثاقب قدوائی، کابینہ:- مرزا انور بیگ، عمر فاروق، قمر جہاں، رضیہ سلطانہ، باقر رضا، مہدی بیگ، اکرم ناصر آغا، فاروق اعظم اور محمود اعظم کاظمی۔

ادارہ علیگ نئی منسٹری کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔ اس دفعہ کے یونین الیکشن اپنی نوعیت کے اعتبار سے تاریخی حیثیت کے مالک ہیں۔ اور قابل تعریف چیزوں میں سے جنازے کی رسم ہے جس میں پیٹنے والوں اور پٹوانے والوں دونوں نے صبر و تحمل اور اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا۔

ایڈیٹر علی گڑھ میگزین (انگریزی)

مسٹر تقی امام بی۔ اے آنرز (فائنل) کو علی گڑھ میگزین (انگریزی) کا ۵۷-۱۹۵۶ء کیلئے ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ تقی صاحب انگریزی ادب کے ایک ہونہار طالب علم ہیں۔ امید ہے کہ انکی ادارت میں میگزین قابل قدر ترقی کریگا۔

گویا آصف علی کو ڈانٹ رہی ہوں۔ آخر میں زیدی صاحب نے منتخب اراکین کو اپنی مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا "صرف آپ ہی نہیں بلکہ وہ لوگ بھی قابل مبارکباد ہیں جنھوں نے آپ کو منتخب کیا ہے"۔ انھوں نے رسم تقریب کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا "یہ ایک ایسا موقع ہوتا ہے جب لوگ الیکشن کی تمام تلخیوں کو بھلا دیتے ہیں"۔ زیدی صاحب نے فرمایا "جس چیز نے میری ہمت بڑھائی اور مجھے علی گڑھ آنے پر آمادہ کیا وہ میرا مکمل اعتماد تھا یہاں کے نوجوانوں پر۔ میری ساری امیدیں آپ سے وابستہ ہیں۔ سب سے پہلے آپ ہیں، اس کے بعد اساتذہ اور اس کے بعد ملک و قوم"۔ انھوں نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا "میں چاہتا ہوں کہ اس یونیورسٹی کے معاملات میں آپ کی بات زیادہ سے زیادہ سنی جائے۔ یونیورسٹی آپ کے لئے ہے اور ہم سب لوگ آپ کی خدمت کیلئے حاضر ہیں۔ جب ہم آپ کی رائے کو اہمیت دیتے ہیں تو یہ بھی توقع کرتے ہیں کہ آپ ہمارے بارے میں رائے قائم کرنے میں سوجھ بوجھ سے کام لینگے"۔ زیدی صاحب نے صدر کے خطبہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا "انھیں کمزوریوں کے احساس دلانے کی ضرورت نہیں، کمزوریوں کا آپ سے زیادہ مجھے احساس ہے۔ اچھائیوں کی طرف غور کرنے کی مجھے ضرورت نہیں۔ میں خامیوں کو دور کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ جناب صدر نے جن امور کی طرف اشارہ کیا ہے وہی چیزیں کم از کم میرے لئے پریشانی کا سبب بنی ہوئی ہیں۔ آپ یقین رکھئے ان پر پوری توجہ کی جائے گی۔ آپ لوگوں کے جلسوں میں یونین کی شاندار روایات کا اظہار ہوا کرتا ہے۔ ماضی کی چیزوں پر غور کیجئے، لیکن نگاہ مستقبل پر ہونی چاہئے۔ زندہ قومیں آنے والی کل کا خیال کرتی ہیں"۔

انھوں نے ہال کے شور اور بدنظمی کا ذکر کرتے ہوئے کہا "آج جس جوش کا مظاہرہ کیا گیا اس سے دل بہت خوش ہوا، لیکن آپ کے جلسوں کی فضا پروقار اور سنجیدہ ہونی چاہئے کہ اگر امریکہ یا برطانیہ سے کوئی آئے تو اسے خیال ہو کہ وہ آکسفورڈ کی یونین میں بیٹھا ہے، کسی اسکول کی یونین میں نہیں۔ آپکو کچھ ضبط اور سلیقہ سیکھنا پڑیگا، روایات بدلنے کی ضرورت ہے"۔

یونین کے پروگرام کے بارے میں انھوں نے کہا "آپ یونین کے کام سے غافل نہ ہوئیے۔ یہ کچھ اچھا نہیں کہ سال میں صرف پانچ چھ ڈیبیٹ ہوں۔ مجھے امید ہے نئی کابینہ اس طرف توجہ دیگی"۔

آخر میں ہال کے اصرار پر زیدی صاحب نے ایکدن کی چھٹی بھی دیدی۔

انجینیرنگ نمائش

پچھلے ہفتہ انجینیرنگ کالج کی سالانہ نمائش ہوئی جسمیں طلباء کے بنائے ہوئے ماڈل پیش کئے گئے۔ نمائش کے دوران میں فلم شو اور دوسرے تفریحی پروگرام بھی ہوئے۔ مختلف علمی مسائل پر سمپوزیم بھی منعقد کئے گئے اور مباحثے ہوئے۔ انجینیرنگ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی تشکیل بھی عمل میں آئی۔ یہ ایسوسی ایشن اولڈ بوائز ایسوسی ایشن سے ملحق رہے گی۔ انجینیرنگ کی نمائش کے ساتھ ہی حیوانیات، نباتات اور نفسیات کے شعبوں نے بھی اپنی اپنی نمائشیں کیں۔ گرلس کالج کی طرف سے مجسمہ سازی اور دوسرے فنون لطیفہ کی نمائش کی گئی۔ ایک فوٹوگرافی کی نمائش بھی آراستہ کی گئی تھی۔ پروگرام کی کامیابی کے لیے پرنسپل حمید اللہ خاں صاحب اور پروفیسر ڈے قابل مبارکباد ہیں۔

اندرانی رحمٰن علی گڑھ میں

ملک کی مشہور و معروف رقاصہ اور بھارتیہ نرتیم رقص کی ایک ممتاز نمائندہ اندرانی رحمٰن نے ۱۷ر نومبر کو کینیڈی ہال میں اپنے فن کا شاندار مظاہرہ کیا۔ پروگرام ڈاکٹر حبیب الرحمٰن، بی۔ اے خان صاحب اور بیگم قدسیہ زیدی کی کوششوں کا مرہون منت تھا۔ معلوم نہیں لوگ سنگ بنیاد کے جلسے اور رقص و موسیقی کی محفل میں فرق نہ کر سکے۔

نکالے ہوئے طلباء کو واپس بلایا جائے

یونین کی پچھلی منسٹری نے ایک اہم رزولیوشن پاس کیا جسمیں یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ اگست کے معمولی سے ہنگامہ پر نکالے گئے طلباء کے سلسلہ میں اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کریں۔ یہ ایک معمولی غلطی کی بہت سخت سزا تھی اور اسلئے جتنی سزا مل چکی وہ کافی سے زیادہ ہے۔ ہم بھی درخواست کرتے ہیں کہ ڈسپلنری کمیٹی اس پر ایک بار پھر ہمدردی سے غور کرے۔

دہلی کالج اردو ڈیبیٹ

۲۳ر نومبر کو دہلی کالج ڈیبیٹنگ کلب میں دہلی کالج کی سالانہ اردو ڈیبیٹ منعقد ہوئی۔ علی گڑھ سے سلطان علی شیدا اور سید آصف علی نے شرکت کی۔ مباحثہ کا عنوان تھا "اس ایوان کی رائے میں اردو زبان اور ادب کا مستقبل روشن ہے"۔ آصف صاحب کو سیکنڈ پرائز ملا۔ اور مجموعی طور پر نمبر زیادہ حاصل کرنے کی وجہ سے ٹرافی علی گڑھ نے جیتی۔ یہ ٹرافی گزشتہ ۳ سال سے علی گڑھ متواتر جیت رہا ہے۔

کھیل کے میدان سے (ت۔ ا)

۱۹ر نومبر سے انٹرورسٹی (زنانہ و مردانہ) بیڈمنٹن ٹورنامنٹ علی گڑھ میں شروع ہوئے۔ اسمیں پنجاب، ساگر، دہلی، علی گڑھ، آگرہ، لکھنؤ، الہ آباد، بنارس، پٹنہ اور گوہاٹی یونیورسٹیوں کے لڑکے اور لڑکیاں کھیل میں حصہ لے رہے ہیں۔

پہلے دن علی گڑھ نے گوہاٹی کو ہرا دیا۔ آگرہ سے ساگر کا میچ ہوا جس میں ساگر یونیورسٹی ہار گئی۔ دوسرے دن میں آگرہ نے دہلی یونیورسٹی کو جیت لیا۔ کوارٹر فائنل میں علی گڑھ لکھنؤ سے ہار گیا۔ پنجاب یونیورسٹی بنارس کو ہرا چکی ہے اور الہ آباد پٹنہ کو۔ ابھی ٹورنامنٹ جاری ہیں اور مزید خبروں کا انتظار ہے۔

پچھلے ہفتہ مراد آباد کرکٹ ٹیم علی گڑھ آئی اور ہماری ٹیم سے میچ ہوا جو ڈرا ان رہا۔

انٹرہال کرکٹ ہو رہی ہے۔ ابھی تک ایس ایس ہال، آفتاب ہال کو ہرا چکا ہے اور وی ایم ہال انجینیرنگ کو۔ ایم یو اسکول سٹی اسکول کو جیت چکا ہے۔